قطبِ عالم

حضرت پیر سیّد مہر علی شاہ گیلانی رحمۃ اللہ علیہ

محمد خالد جذبی

حُسین پبلیکیشنز گوجرانوالا

قطبِ عالم

حضرت پیر سیّد مہر علی شاہ گیلانی رحمۃ اللہ علیہ

تیرھویں صدی ہجری مسلمانانِ برّصغیر کے لیے بہت پُر آشوب تھی۔ ہندوستان جنگِ آزادی کے خونیں دَور سے گزر کر مکمّل طور پر انگریزوں کے پنجۂ استبداد میں آچکا تھا۔ سلطنتِ مغلیہ دم توڑ چکی تھی اور دینِ اسلام کے علم وہدایت کے روشن چراغ انقلابِ زمانہ کے ہاتھوں یا تو گُل ہو چکے تھے، یا قید و بند کی صعوبتوں سے گزر رہے تھے اور یا ترکِ وطن کر کے برِّصغیر سے رخصت ہو چکے تھے، چنانچہ ایسے وقت میں جبکہ ایک غیر مسلم مادّہ پرست قوم کے اقتدار ونظریات کا عفریت مسلمانانِ برّصغیر پر چھا رہا تھا اور اِس خطّے میں اسلامی شریعت وطریقت کے لیے گونا گوں مشکلات پیدا ہو رہی تھیں، اللہ کریم نے ایسی پاک ہستیوں کو وجود بخشا جن کی علمی و روحانی قوّت سے نہ صرف اسلام مادّہ پرستی کے مسموم اثرات سے محفوظ رہا، بلکہ مسلمانوں میں بھی حیاتِ نو کے آثار پیدا ہونے شروع ہو گئے جو بالآخر اِس خطّے میں مسلمانوں کی ایک آزاد حکومت کے منصّۂ شہود پر آنے کا باعث بنے۔ قطبِ عالم حضرت پیر سیّد مہر علی شاہ گیلانی رحمۃ اللہ علیہ اُنھی پاک ہستیوں میں سے ایک تھے۔

حضرت پیر سیّد مہر علی شاہ گیلانی رحمۃ اللہ علیہ خاندانِ سادات کے روشن

چراغ تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب پچیّس واسطوں سے غوثِ اعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللّٰہ علیہ اور چھتّیس واسطوں سے شہزادۂ کونین حضرت امام حسن علیہ السّلام سے جاملتا ہے۔ آپ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے منجھلے بیٹے حضرت سیّد تاج الدّین عبدالرزّاق قادریؒ کی اولاد میں سے ہیں۔ حضرت سیّد تاج الدّین عبدالرزّاق قادریؒ کے بیٹے حضرت سیّد ابوصالح نصر قادریؒ تھے اور حضرت سیّد ابوصالح نصر قادریؒ کے بیٹے حضرت سیّد علی قادریؒ تھے۔ حضرت سیّد علی قادریؒ کی چوتھی پشت میں حضرت سیّد تاج الدّین محمود قادریؒ ہوئے جو نویں صدی ہجری میں سلسلۂ عالیہ قادریہ رزّاقیہ کا عطیہ لے کر بنگال پہنچے۔ اُن دنوں سلاطینِ بنگال کا پایۂ تخت گوڑ تھا۔ سلطان فیروز شاہ نے اُن کی خانقاہ کے لیے جاگیر مقرّر کی اور وہ کافی عرصے تبلیغ فرمانے کے بعد اپنے فرزند حضرت سیّد ابی الحیات قادریؒ کو مسندِ ارشاد پر چھوڑ کر واپس بغداد چلے گئے۔ حضرت سیّد ابی الحیات قادریؒ شہنشاہ ہمایوں کے دَور تک زندہ رہے۔ اُن کی وفات پر اُن کے فرزند حضرت سیّد شاہ میراں قادر قمیص قادریؒ اُن کے جانشین ہوئے اور برِصغیر میں بہت شہرت پائی۔ جب شہنشاہ ہمایوں اور شیر شاہ سوری کے درمیان جنگوں کے باعث ملک میں بدامنی پھیلی تو وہ بغداد چلے گئے اور کئی سال بعد امن بحال ہونے پر گنگوہ واپس آئے۔ اُس وقت حضرت شیخ عبدالقدّوس گنگوہیؒ کا بڑا شہرہ تھا۔ اُنھوں نے اپنی جلالتِ شان کے باوصف شہر سے باہر نکل کر اُن کا استقبال کیا اور کچھ عرصے اپنا مہمان بنا کر سلسلۂ عالیہ چشتیہ صابریہ کے اورادو وظائف عطا فرمائے۔ وہ گنگوہ سے بنگال چلے گئے، مگر وہاں حالات سازگار نہ پا کر ساڈھورا میں سکونت اختیار کرلی۔ دسویں صدی ہجری میں جب شہنشاہ اکبر نے بہار فتح کیا تو اُنھیں بنگال

کے سلطان بایزید کے پاس اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ اُنھی دنوں بہار کا ایک ہندو را جا اور اُس کی رانی اُن کی روحانیت سے متاثر ہو کر حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔ شاہانِ مغلیہ نے اُن کی خانقاہ کے لیے چھ گاؤں نذر کیے۔ اُن کی تیرھویں پشت میں حضرت سیّد روشن دین شاہ گیلانیؒ اور حضرت سیّد رسول شاہ گیلانیؒ ہوئے۔ اُس وقت ہندوستان کے تخت پر شاہ عالم ثانی بیٹھا ہوا تھا۔ بنگال پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا، پنجاب پر سکھ قابض ہو رہے تھے اور دہلی پر انگریز اور مرہٹے نظریں لگائے بیٹھے تھے، اِس لیے اِن دونوں بھائیوں نے پنجاب کے شمال مغربی گوشے کو جائے امن وسکون اور مقاصدِ تبلیغ و ارشاد کے لیے موزوں خیال کرتے ہوئے ساڈھورا سے نقلِ مکانی کر کے گولڑہ شریف میں سکونت اختیار کر لی۔ یہ قصبہ پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں کوہِ مارگلا کے دامن میں واقع ہے۔ حضرت سیّد روشن دین شاہ گیلانیؒ کے بیٹے حضرت سیّد غلام شاہ گیلانیؒ کی شادی اپنے چچا حضرت سیّد رسول شاہ گیلانیؒ کی بیٹی سے ہوئی جو حضرت سیّد میراں شاہ گیلانیؒ اور حضرت سیّد فضل الدّین شاہ گیلانیؒ کی بہن تھیں۔ اِس رشتے سے حضرت سیّد نذرالدّین شاہ گیلانیؒ تولّد ہوئے۔ حضرت پیر سیّد مہر علی شاہ گیلانی رحمۃ اللّٰہ علیہ اِنھی حضرت سیّد نذرالدّین شاہ گیلانیؒ کے فرزند تھے۔

حضرت پیر سیّد مہر علی شاہ گیلانی رحمۃ اللّٰہ علیہ یکم رمضان المبارک ۱۲۷۵ھ/ ۱۴/اپریل ۱۸۵۹ء کو پیر کے روز گولڑہ شریف میں پیدا ہوئے۔ آپ کی ولادت کے بارے میں آپ کے خاندان میں پہلے ہی سے بشارتیں چلی آ رہی تھیں۔ آپ کے والدین اور والد کے ماموں خانقاہِ قادریہ کے سجّادہ نشین حضرت پیر سیّد فضل الدّین شاہ گیلانیؒ اِس امر سے مطّلع تھے کہ اِس گھر میں ایک نورانی چراغ

روشن ہونے والا ہے۔ آپ کی ولادت سے چند روز پہلے ایک عمر رسیدہ مجذوب خانقاہ میں آ کر مقیم ہو گئے تھے اور عنقریب پیدا ہونے والے ایک مقبولِ الٰہی کی زیارت کا ذکر کرتے تھے، چنانچہ جب آپ تولّد ہوئے تو یہ مجذوب حرم سرا کی ڈیوڑھی میں آئے، آپ کے ہاتھ چومے اور رخصت ہو گئے۔

آپ کی تعلیم و تربیت آپ کے والدین اور حضرت پیر سیّد فضل الدّین شاہ گیلانیؒ کی نگرانی میں ہوتی رہی۔ آپ کی عمر ابھی چار سال نہ ہوئی تھی اور عربی کا پہلا قاعدہ پڑھتے تھے کہ ایک روز حضرت پیر سیّد فضل الدّین شاہ گیلانیؒ ظہر کی نماز کے لیے باہر تشریف لائے تو دیکھا کہ آپ خانقاہ کے باہر جھاڑیوں میں قاعدہ لیے سو رہے ہیں۔ وہ جگہ سایہ دار نہ تھی اور زمین آفتاب کی تمازت سے تپ رہی تھی۔ اُنھوں نے اُسی وقت اپنی چھتری سے سایہ کیا اور اُٹھوا کر گھر بھجوانے کے لیے خادم کو بلوایا۔ جب تک خادم نہ آیا، خود سایہ کیے کھڑے رہے اور فرمایا، ”یہ ابھی معصوم ہے، اِسے معلوم نہیں کہ ایک روز یہ کیا ہونے والا ہے۔“

آپ کو قرآنِ کریم پڑھنے کے لیے خانقاہ کی درس گاہ اور فارسی و اردو کے لیے مدرسے میں داخل کرایا گیا۔ آپ کے حافظے کی یہ حالت تھی کہ قرآن کا روزانہ سبق حفظ کر کے سنا دیا کرتے تھے۔ جب قرآن ناظرہ ختم کیا تو اُس وقت پورا قرآن آپ بلا ارادہ حفظ بھی کر چکے تھے۔ عربی و فارسی اور صرف و نحو کی تعلیم کے لیے حضرت پیر سیّد فضل الدّین شاہ گیلانیؒ نے پکھلی کے مولانا غلام محی الدّین کو مقرّر کیا جنھوں نے آپ کو کافیہ تک تعلیم دی۔ کچھ عرصے بعد اُنھوں نے حضرت پیر سیّد فضل الدّین شاہ گیلانیؒ سے عرض کیا کہ اللّٰہ کریم نے صاحبزادے کو ایسا ذہنِ رسا اور اعلا دماغ عطا فرمایا ہے کہ ہر سبق حفظ کر کے سنا دینے کے علاوہ

بعض اوقات ایسے دقیق سوالات کرتے ہیں کہ اُن کے جوابات دینے سے اپنے آپ کو عاجز پاتا ہوں اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں اب اِن کی تعلیم کا صحیح حق ادا نہیں کرسکتا، لہٰذا اِنھیں کسی بڑے اُستاد کے پاس جانا چاہیے؛ چنانچہ آپ کو بھوئی میں مولانا محمد شفیع کے مدرسے میں داخل کرادیا گیا۔ یہاں آپ نے دو ڈھائی سال میں رسائلِ منطق ''قطبی'' تک اور نحو واصول کے درمیانے اسباق کی تعلیم حاصل کی۔ اُس کے بعد انگہ میں مولانا سلطان محمود کے آگے زانوے تلمّذ تہ کیا۔ گھر والے ہر ماہ جو خرچ بھیجا کرتے، آپ اُسے نادار طلبہ میں تقسیم کردیتے اور خود عموماً فاقے سے رہتے۔ جب بھوک زیادہ ستاتی تو طلبہ کے جمع کردہ ٹکڑوں میں سے کچھ تناول کرلیتے۔ آپ کے اِس جودوسخا کو دیکھ کر طلبہ آپ سے بے حد محبت کرنے لگے۔

انگہ کے نواح میں قصیدۂ غوثیہ کے ایک عامل نے لوگوں میں اپنا بہت اثرورسوخ قائم کر رکھا تھا۔ لوگ اُسے دیکھتے ہی تعظیماً کھڑے ہو جاتے اور دست بوسی کرتے۔ ایک روز وہ مسجد میں آیا تو سب لوگ کھڑے ہوگئے، مگر آپ بیٹھے رہے۔ اُس نے ناراض ہوکر کہا، ''اے لڑکے! کیا تو مجھے نہیں جانتا، پڑھوں قصیدہ؟'' آپ نے فرمایا، ''تم قصیدہ پڑھو اور میں قصیدے والے کو بلاتا ہوں۔'' اِن الفاظ سے اُس پر ایک خاص کیفیت طاری ہوگئی۔ اُس نے آپ سے معذرت کی، پاؤں چھوئے اور چلا گیا۔

آپ کی طبیعت پر ابتدا ہی سے عشقِ الٰہی کا رنگ غالب تھا۔ نہایت خوش آواز تھے، اکثر جنگلوں اور ویرانوں کی طرف نکل جاتے اور بلند آواز میں پُرسوز اشعار پڑھتے۔ تعلیم وتعلّم میں بھی اِس قدر انہماک تھا کہ خود پڑھنے کے ساتھ ساتھ

چھوٹے درجے کے طلبہ کو پڑھایا بھی کرتے تھے۔ بسا اوقات عشا کی نماز کے بعد سردیوں کی طویل راتیں مطالعے میں کٹ جاتیں، یہاں تک کہ فجر کی اذان ہو جاتی۔

تقریباً ڈھائی سال انگہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب آپ گولڑہ شریف واپس آئے تو درسِ نظامی میں صَرف، فلسفہ، معقول، ریاضی اور فقہ کی آخری کتابیں، حدیث میں صحاحِ ستہّ اور تفسیر میں بیضاوی وغیرہ باقی رہ گئی تھیں۔ اِن کتابوں کی تعلیم کے لیے اُن دنوں عام طور پر طالبانِ علم برِّصغیر کے مشہور مدارس کا رخ کیا کرتے تھے، چنانچہ ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء میں پندرہ سال کی عمر میں آپ کانپور روانہ ہو گئے۔ وہاں آپ مولانا احمد حسن کانپوریؒ کے پاس پہنچے، لیکن وہ حج کے سفر کی تیاری کر رہے تھے، فرمایا: ''میاں صاحبزادے! میں آج سے آٹھویں روز حج پر روانہ ہو رہا ہوں، اِس عرصے میں دو چار سبق پڑھ بھی لو گے تو کیا ہوگا؟ بہتر ہے کہ علی گڑھ جاؤ اور میرے اُستاد مولانا لطف اللّٰہ علی گڑھیؒ سے پڑھو۔'' چنانچہ آپ علی گڑھ گئے اور مولانا لطف اللّٰہ علی گڑھیؒ کے درس میں شریک ہو گئے۔ مولانا لطف اللّٰہ علی گڑھیؒ مفتی عنایت احمد کاکورویؒ کے شاگرد تھے اور وہ مولانا بزرگ علی مارہرویؒ اور شاہ محمد اسحاق دہلویؒ کے شاگرد تھے۔ مولانا لطف اللّٰہ علی گڑھیؒ اپنے علم و فضل کے باعث برِّصغیر کی علمی دنیا میں اُستاذ العلما تسلیم کیے جاتے تھے اور اُن کی شاگردی فضل و کمال کی سب سے اعلا و ارفع سند شمار ہوتی تھی۔ علی گڑھ میں آپ نے تقریباً ڈھائی سال تعلیم حاصل کی اور اپنی قابلیت، بلند اخلاقی اور مثالی کردار کے باعث اپنے اُستاد اور ہم مکتبوں میں نہایت مقبولیت اور توقیر پائی۔ سب آپ کی ذہانت اور نکتہ رسی

کے معترف تھے۔ علی گڑھ سے فارغ ہو کر آپ سہارنپور گئے اور مولانا احمد علی سہارنپوریؒ کے درس میں شامل ہو گئے۔ مولانا احمد علی سہارنپوریؒ فنِ حدیث کے امام تصوّر کیے جاتے تھے۔ بخاری شریف پر اُن کے حواشی اُن کی علمیت اور قابلیت کا بیّن ثبوت ہیں۔ وہ مولانا عبدالحئیؒ لکھنویؒ اور شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے شاگرد تھے۔ بعدازاں اُنھوں نے مکّۂ مکرّمہ جا کر شاہ محمد اسحاق دہلویؒ سے درسِ حدیث لیا اور سند حاصل کی۔ اُن دنوں حاجی امداداللّٰہ مہاجر مکّیؒ بھی وہاں مستقل قیام رکھتے تھے۔ ایک روز حاجی صاحب نے اُن سے کہا کہ چونکہ میں نے آپ سے گلستان کے اسباق پڑھے ہیں اِس لیے آپ میرے اُستاد ہیں، اگر محسوس نہ فرمائیں تو مشورتاً عرض کرتا ہوں کہ دوسروں کے مدارس میں ملازمت کرنے کے بجائے اپنا درسِ حدیث شروع کیجیے تو زیادہ مفید رہے گا۔ اُنھوں نے یہ مشورہ قبول کیا اور حجازِ مقدّس سے واپس آ کر سہارنپور میں درسِ حدیث شروع کیا اور سیکڑوں علما کو محدّث بنا دیا۔ برِّصغیر میں ہر طبقے کے علما میں سے اکثر کی سندِ حدیث اُن تک پہنچتی ہے۔ اُنھوں نے آپ پر بے حد شفقت فرمائی اور اسباق میں آپ کے ساتھ امتیازی سلوک فرمایا۔ پھر آپ کی قلبی و روحانی کیفیات سے آگاہ ہوئے تو محسوس کیا کہ یہ طالبِ علم محقّقانہ بصیرت کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ عشقِ الٰہی کے بھی اعلا مقام پر فائز ہے اور اللّٰہ کریم اِس سے علومِ ظاہری و باطنی کی خدمت لینے والا ہے، اِس لیے اِسے زیادہ دیر روکنا دین کی خدمت کے منافی ہے؛ چنانچہ ایک روز اُنھوں نے اپنے دولت کدے پر آپ کی دعوت کی اور سندِ حدیث عطا کر کے فرمایا، ''آپ کو مزید پڑھنے کی ضرورت نہیں، وطن تشریف لے جائیے اور دین کی خدمت کیجیے۔'' چنانچہ ۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء میں بیس سال کی

عمر میں علومِ رسمیہ کی تکمیل کر کے آپ گولڑہ شریف واپس آ گئے اور ہمہ تن درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ ابتدا میں طلبہ کی تعداد پچاس کے لگ بھگ تھی، پھر بہت جلد آپ کے طریقِ درس کی گرد و نواح میں دھوم مچ گئی اور طلبہ کے علاوہ اکثر ہمعصر علما بھی استفادے کے لیے حاضر ہونے لگے۔ اُنھی دنوں آپ سیال شریف حاضر ہوئے اور سلسلۂ عالیہ چشتیہ نظامیہ میں حضرت خواجہ شمس الدّین سیالویؒ سے بیعت ہوئے، جبکہ سلسلۂ عالیہ قادریہ جدّیہ میں آپ پہلے ہی سے حضرت پیر سیّد فضل الدّین شاہ گیلانیؒ سے بیعت تھے۔

آپ فرماتے تھے کہ مجھے ابتدا ہی سے حضرت جبریل علیہ السّلام کے تمثّلِ بشری کے واقعے سے وحدتِ وجود کی جانب ذوق گواہی دیتا تھا اور اِس مسلک پر وحدت الشّہود والوں کے اعتراضات و دلائل بھی میرے پیشِ نظر تھے۔ آخر مشائخِ عظام اور اپنے شیخِ طریقت کے روحانی تصرّف سے اِسی عالمگیر مسلک، یعنی وحدت الوجود ہی پر طبیعت پختہ ہو گئی۔ حضرت خواجہ سیالویؒ نے مجھے شیخ ابنِ عربیؒ کی ''فتوحاتِ مکّیہ'' کے مطالعے کی تاکید فرمائی، چنانچہ اُن کی توجّہ سے اِس مسئلے کے بیشتر اَسرار مجھ پر منکشف ہوتے چلے گئے۔

حضرت خواجہ شمس الدّین سیالویؒ نے آپ کے علمی و عرفانی کمالات کے پیشِ نظر آپ کو تمام اشغال و وظائف کی اجازت اور بیعت و ارشاد کا منصب عطا فرمایا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ آپ حضرت خواجہ سیالویؒ کے آخری خلیفہ ہیں۔ یہ امر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ حضرت خواجہ سیالویؒ کی آپ پر خاص نظرِ عنایت تھی اور اُنھوں نے آپ کی دوسرے مخلصین سے علیحدہ اور جداگانہ رنگ میں تربیت فرمائی تھی۔

حضرت خواجہ شمس الدّین سیالویؒ کی زندگی میں آپ کی توجّہ زیادہ تر درس وتدریس، ریاضت وعبادت اور وقتاً فوقتاً سیال شریف کی حاضری اور استفادے پر رہی۔ جب ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء میں اُن کا وصال ہو گیا تو آپ پر غم واندوہ کی عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ نماز ادا کرتے، وظائف پڑھتے، حتّٰی کہ اُٹھتے بیٹھتے آپ پر گریہ طاری رہتا۔ کچھ عرصے یہی حالت رہی، پھر سفروں کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ آپ کئی کئی مہینے متواتر غائب رہتے اور پتا نہ چلتا کہ کہاں ہیں۔ کبھی اچانک واپس آ جاتے اور مختصر قیام کے بعد پھر کہیں روانہ ہو جاتے۔ کبھی تنہا ہوتے اور کبھی کسی کو ساتھ لے لیتے، کہیں زیادہ قیام کرتے اور کہیں کم۔ اِسی دوران قطبِ اعظم حضرت خواجہ معین الدّین چشتی رحمۃ اللّٰہ علیہ کے مزارِ مبارک پر حاضر ہوئے اور وہاں سے کسی غیبی اشارے کے تحت واپس آ کر ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء میں حجازِ مقدّس کا سفر اختیار کیا۔

اِس سفرِ مقدّس میں جہاز میں خواجہ عبدالرحمٰن چھورویؒ درودِ مُستغاث پڑھ رہے تھے۔ ایک مکرانی عالم نے ندائے غائبانہ پر اعتراض کیا۔ خواجہ صاحب نے آپ سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا، ''جائز ہے۔'' مکرانی عالم کو معلوم ہوا تو اُنھوں نے آپ سے اِس کے جواز میں ثبوت مانگا۔ آپ نے فرمایا، ''حدیثِ بخاری۔'' وہ کہنے لگے، ''حاجی رحمت اللّٰہ کیرانویؒ تیس سال سے بخاری کا درس دے رہے ہیں اور ایسی ندائے غائبانہ کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔'' آپ نے فرمایا، ''حاجی صاحب بھی ہماری ہی طرح ایک انسان ہیں۔'' مکرانی عالم نے کہا، ''کیا آپ اُن کے سامنے یہ فقرہ کہہ دیں گے؟'' آپ نے فرمایا، ''ہاں، کہہ دوں گا۔'' اُن دنوں حاجی صاحب مدرسۂ صولتیہ کی صدارت پر متمکّن تھے۔ مکرانی عالم

حاجی صاحب کے شاگرد تھے اور وطن میں تعطیلات گزارنے کے بعد مکّۂ مکرّمہ واپس جا رہے تھے۔ اُنھوں نے مکّۂ مکرّمہ پہنچ کر حاجی صاحب سے ذکر کیا تو اُنھوں نے کہا کہ اچھی بات ہے، وہ ملیں تو اُنھیں لے آئیے گا، اُن کے دلائل سنیں گے، مگر حاجی صاحب کے نائب مدرّس مولانا محمد غازیؒ جوش میں آ گئے اور آپ کے علم کا امتحان لینے اور آپ کو لاجواب کرنے کے خیال سے کئی کتابوں میں سے مشکل اور ادق علمی سوالات جمع کرنے شروع کر دیے۔ خود مولانا بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک دوسرے بنگالی عالم سے مل کر کچھ مشکل علمی سوالات جمع کیے کہ آپ سے پوچھیں گے۔ بہت تلاش کے بعد ہم نے آپ کو بیت اللّٰہ شریف کے سامنے مراقب پایا۔ جب ہم قریب گئے تو آپ نے بیٹھنے کا اشارہ کیا، لیکن آپ پر کچھ ایسی کیفیت طاری تھی کہ جونہی ہماری نظر پڑی، ہم پر رقّت طاری ہوگئی اور بحث ومباحثے کا خیال دل سے جاتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد آپ نے ہم سے حال پوچھا، مگر ہم سے بات نہ ہوسکی۔ آخرِکار میں نے آپ سے مدرسۂ صولتیہ میں قیام کی درخواست کی۔ آپ نے یہ درخواست قبول فرمالی اور ہمارے ساتھ تشریف لے آئے۔ وہیں مدرسے میں ایک روز آپ کی حاجی صاحب سے درودِ مُستغاث پر گفتگو ہوئی۔ آپ نے ندائے غائبانہ کے مسئلے پر بخاری کی ایک حدیث پر ایسی مدلّل اور پُراثر تقریر کی کہ حاجی صاحب مبہوت رہ گئے اور فرمایا، ''یہ تو علمِ لدنی ہے، ہم سال ہا سال سے بخاری کی یہ حدیث پڑھا رہے ہیں، لیکن اِن معانی کی طرف کبھی ذہن نہیں گیا جو آپ نے استنباط کیے ہیں۔''

حاجی صاحب چونکہ نہایت منصف مزاج عالم تھے اس لیے شرعی دلیل سے ندائے غائبانہ کی معقول وجہ سمجھ میں آ جانے کے بعد فوراً اپنا مسلک تبدیل کرلیا اور

آپ کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ آپ سے بیعت کی استدعا بھی کی، مگر آپ نے اُن کی عمر اور علم کا لحاظ کرتے ہوئے بیعت لینے سے عذر فرمایا، البتہ اوراد و وظائف تلقین فرمادیے۔

ایک روز آپ مولانا محمد غازیؒ کے ساتھ حاجی امداد اللہ مہاجر مکّیؒ کے درس میں حاضر ہوئے۔ اُس وقت وہ مولانا رومیؒ کی ''مثنوی'' کا درس دے رہے تھے۔ درس کے دوران ایک شعر ایسا آیا جس میں آرزوئے وصل کی شدّت کا اظہار تھا۔ وہ شعر یہ تھا:

ہر کسے کو دُور ماند از اصلِ خویش
باز جوید روزگارِ وصلِ خویش

ایک شاگرد نے سوال کیا کہ مولانا رومیؒ تو وحدت الوجود کے قائل ہیں، جہاں دوئی کا تصوّر ہی نہیں، پھر یہ وصل کی تمنّا چہ معنی دارد؟ حاجی صاحب نے جواب میں کچھ فرمایا، مگر دریافت کرنے والے کی تسلّی نہ ہوئی اور اُس نے اپنا سوال دہرایا۔ آپ نے حاجی صاحب سے عرض کیا، ''حضرت! طالبِ علم اپنے سوال کا مفہوم پوری طرح ادا نہیں کر پا رہا ہے، اگر اجازت ہو تو میں اُس کے سوال کا منشا عرض کروں۔'' حاجی صاحب نے فرمایا ''کیا مضائقہ ہے۔'' جب آپ نے سوال کی وضاحت فرمائی کہ وصل ایک امرِ اضافی ہے جو دوئی کا متقاضی ہے، حالانکہ وحدت الوجود اِس کے منافی ہے، تو حاجی صاحب کا دل بھر آیا اور فرمایا، ''اچھا، اب اِس کا جواب بھی آپ ہی بیان فرمائیں۔'' آپ نے عرض کیا، ''وصل کے معنی ہستیٔ موہومہ کو مٹانا ہے۔ غیریت کی نفی نفس الامر میں ہے اور حقیقت میں محبوبِ حقیقی کے بغیر کوئی غیر موجود نہیں، مگر وہم کے غلبے سے تغائر پیدا

ہو گیا ہے اور وہ اُس وقت تک باقی رہتا ہے جب تک فنائے کامل حاصل نہیں ہوتی۔ طلب اور عشق کے تمام منازل میں ایک وہمی غیریت باقی رہتی ہے، اِس لیے فراق بھی ہوتا ہے اور وصال کی طلب بھی ہوتی ہے۔''

آپ نے اپنی اِس جوابی تقریر کو مولانا رومیؒ اور حافظ شیرازیؒ کے کلام اور شیخ ابنِ عربیؒ کے ارشادات سے مزیّن و مرصّع کر کے کچھ ایسے پُر کیف انداز میں ادا فرمایا کہ حاجی صاحب وجد میں آ گئے۔ کچھ دیر بعد جب اُن کی طبیعت سنبھلی تو اپنا سلسلۂ عالیہ چشتیہ صابریہ آپ کو عطا کیا اور فرمایا، ''اگرچہ آپ کو اِس کی حاجت نہیں، مگر میں چاہتا ہوں کہ آپ کی وجہ سے شمالی ہند میں میرے سلسلے کی بھی ترویج ہو۔'' آپ نے عرض کیا، ''آپ کی عنایت کا شکریہ، مجھے طوافِ کعبہ کی طرف قلبی توجّہ نہیں ہوتی، اگر ہو سکے تو اِس قدر مہربانی فرمائیں کہ اللہ کرے، یہ ہو جائے۔'' حاجی صاحب نے فرمایا، ''میں بھی تقریباً تیس سال سے ایسی ہی کیفیت میں مبتلا ہوں۔''

بہت عرصے بعد ایک روز آپ نے فرمایا کہ جس شخص کا مطمحِ نظر ذات ہو، وہ آثار و افعال اور صفات کی طرف متوجّہ نہیں ہوتا۔

بیت اللہ شریف اور دربارِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی حاضری کے وقت ایک عام مسلمان کے ذوق و شوق کی جو کیفیت ہوتی ہے، وہی بیان میں نہیں آ سکتی تو اولیاء اللہ کی کیفیات کا کون اندازہ لگا سکتا ہے؛ چنانچہ آپ کے عشق و نیاز کی ایک معمولی سی جھلک آپ کی ایک مشہور نعت ''اَج سِک متراں دی وَدھیری اے'' میں بھی پائی جاتی ہے۔ آپ نے اِس نعت میں اُس کیفیت کا نقشہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو وادیِ حرا میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے

دیدارِ پُرانوار سے مشرف ہونے پر رُونما ہوئی تھی۔ اِس واقعے کے متعلّق آپ کی ایک قلمی تحریر بھی ہے۔ یہ تحریر فارسی زبان میں ہے، جس کا اردو ترجمہ درج کیا جاتا ہے:

مدینۂ منوّرہ کے سفر میں وادیِ حمرا کے مقام پر ڈاکوؤں کے حملے کی وجہ سے مجبوراً عشا کی سنّتیں مجھ سے رہ گئیں۔ میں سو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سیاہ جبّہ زیبِ تن فرمائے تشریف لائے ہیں اور اپنے جمالِ باکمال سے مجھے نئی زندگی عطا فرمائی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں مراقبے کی حالت میں دو زانو بیٹھا ہوں۔ آپ نے قریب تشریف لا کر ارشاد فرمایا کہ آلِ رسول کو سنّتیں ترک نہیں کرنی چاہییں۔ میں نے آپ کی دونوں پنڈلیوں کو، جو ریشم سے بھی زیادہ لطیف تھیں، اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر نالہ و فغاں کرتے ہوئے 'الصّلٰوۃ والسّلام علیک یا رسول اللہ' کہنا شروع کیا اور عالمِ مدہوشی میں روتے ہوئے عرض کیا کہ آپ کون ہیں؟ جواب میں وہی ارشاد ہوا کہ آلِ رسول کو سنّتیں ترک نہیں کرنی چاہییں۔ تین بار یہی سوال و جواب ہوتے رہے۔ پھر میرے دل میں ڈالا گیا کہ جب آپ ندائے یا رسول اللہ سے منع نہیں فرما رہے تو ظاہر ہے کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم ہیں۔ اگر کوئی اَور بزرگ ہوتے تو اِس کلمے سے منع کرتے۔ اُس حسن و جمالِ باکمال کے متعلّق کیا کہوں؟ اُس ذوق و مستی و فیضانِ کرم کے بیان سے زبان عاجز اور تحریر لنگ ہے، البتّہ بادہ خوارانِ عشق و محبت کے حلق میں اُن ابیات سے ایک جرعہ اور اُس نافۂ مشک سے ایک نفحہ ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

اَج سِک متراں دی وَدھیری اے
کیوں دلڑی اُداس گھنیری اے
لُوں لُوں وچ شوق چنگیری اے
اَج نیناں لائیاں کیوں جھڑیاں
مُکھ چند بدر شعشانی اے
مَتھے چمکے لاٹ نورانی اے
کالی زلف تے اَکھ مستانی اے
مخمور اَکھیں ہِن مَدھ بھریاں
اُس صورت نوں میں جان آکھاں
جاناں کہ جانِ جہان آکھاں
سچ آکھاں تے رب دی شان آکھاں
جس شان توں شاناں سب بنیاں
ایہہ صورت ہے بے صورت تھیں
بے صورت ظاہر صورت تھیں
بے رنگ دِسے اُس مورت تھیں
وچ وحدت پُھٹیاں جد گھڑیاں
لاہو مُکھ توں مخطط بُردِ یمن
من بھانوری جھلک دکھاؤ سجن
اوہا مِٹھیاں گالیں الاؤ مِٹھن
جو حمرا وادی سن کریاں

اِنھاں سِکدیاں تے کُرلاندیاں تے
لکھ واری صدقے جاندیاں تے
اِنھاں بردیاں مفت وِکاندیاں تے
شالا آون وت بھی اوہ گھڑیاں
سبحان اللّٰہ ما اجملکَ
ما احسنکَ ما اکملکَ
کِتھے مہر علی، کِتھے تیری ثنا
گستاخ اَکھیں کِتھے جا اَڑیاں

حجازِ مقدّس سے واپس آ کر آپ مقامِ تمکین پر ایسے متمکّن ہوئے کہ پھر بہت کم سفر کیا۔ پہلے پاکپتن شریف اور پھر کچھ عرصے بعد سیال شریف کے عرس کے موقع پر سفر کرتے، کسی خاص مقصد کے لیے بھی کوئی سفر اختیار کر لیتے۔

یہ واضح ہو چکا ہے کہ آپ کس طرح علم و عرفان میں کامل و مکمّل ہو کر بیت اللّٰہ شریف اور دربارِ رسول صلی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم میں حاضر ہوئے، وہاں فیوض و برکات سے دامنِ مراد بھرا اور قطبِ ارشاد کے منصبِ جلیل پر فائز ہو کر مسندِ ارشاد پر جلوہ افروز ہوئے۔ آپ کی ذاتِ گرامی میں مجدّدِ وقت کی جملہ شرائط اور صفات کماحقہٗ موجود تھیں۔

آپ نے ایک لادینی حکومت کی الحاد پرور فضا میں ایک کاذب مدّعیِ نبوّت مرزا غلام احمد قادیانی کے خلاف قلمی اور لسانی جہاد کیا، حتّٰی کہ اِس محاذ پر آپ کو مسلمانوں کے تمام مکاتبِ فکر کی جانب سے متفقہ طور پر قائد تسلیم کیا گیا اور آپ کی تصانیف کو ردِّ قادیانیت میں بے مثال قرار دیا گیا۔ اِن تصانیف کو مشعلِ راہ بنا کر

تحریر وتقریر کے مجاہدین کمر بستہ ہو کر میدان میں اُتر آئے اور اُن کی مساعیِ جمیلہ کی بدولت آج دنیائے اسلام کا ایک عام انسان بھی ختمِ نبوّت کی قادیانی تاویل کو کفر سمجھتا ہے اور قادیانیت ایک علیحدہ، بے اثر اور لاتعلّق اقلّیت بن کر رہ گئی ہے۔

جب مولوی عبداللہ چکڑالوی نے حدیث کی حجت سے انکار کرتے ہوئے ایک نیا فرقہ اہلِ قرآن کھڑا کیا تو آپ نے اِس فتنے کے استیصال کے لیے جگہ جگہ دورۂ حدیث کے درس جاری کرائے۔ اِس کے علاوہ آپ نے نیچریت کی تردید میں بھی بعض مخلصین کے ذریعے مضامین شائع کروائے، جو برِّصغیر میں انگریزی تعلیم وتربیت کے باعث فروغ پا رہی تھی، تاہم آپ نے سرسیّد احمد خاں کے مخالف علما کے اِن نظریات کو بھی ناواجب قرار دیا کہ انگریزی پڑھنا حرام ہے اور برطانوی ہند دارالحرب ہے، اِس لیے یہاں نمازِ جمعہ جائز نہیں۔ آپ نے شہروں میں نمازِ جمعہ کو واجب قرار دیا اور متعدّد مقامات پر ازسرِنو نمازِ جمعہ جاری کرائی، البتہ برطانیہ کی ایسی ملازمت کو جس میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اقدام لازم آتا ہو، ناجائز قرار دیا۔ اِس امر کا اعلان آپ اُس زمانے میں فرماتے رہے جب پہلی جنگِ عظیم زوروں پر تھی اور انگریزوں کا ستارہ عروج پر تھا۔

بریلوی، دیوبندی، وہابی اور دیگر اسلامی مکاتبِ فکر کے اختلافی مسائل پر آپ اپنا مسلک تحریر وتقریر کے ذریعے برابر واضح فرماتے رہے۔ اگرچہ فروعی مسائل میں اختلاف کی بنا پر اِن مکاتبِ فکر کی باہمی کشمکش آپ کو ناپسند رہی، تاہم فریقین کی حق بات کو ہمیشہ سراہا۔ آپ نے امکانِ کذبِ باری تعالیٰ کو

محال، علمِ غیب عطائی وسماعِ موتیٰ کو برحق اور ندائے یارسول اللہ، توسّل و استمدادِ انبیا واولیا، نذر ونیاز، ایصالِ ثواب اور زیارتِ قبور کو جائز قرار دیا۔

آپ نے اربابِ وحدت الشّہود و وحدت الوجود کے درمیان یہ کہہ کر ربط وتعلّق پیدا کیا کہ وحدت الشّہود ابتدائے سلوک اور نفسِ ایمان ہے اور وحدت الوجود انتہائے مقام اور کمالِ ایمان ہے۔ اِس مقام کے لیے نہ تو امِم سابقہ مکلّف تھیں اور نہ ہی جمہورِ امّتِ محمدیہ ہی مکلّف ہیں۔ یہ اخص الخواص کا مشاہدہ اور حال ہے، فقط قال نہیں۔

آپ نے کانگریس میں مسلمانوں کی شمولیت اور جمعیت علمائے ہند کی برپا کردہ تحریکاتِ خلافت وہجرت سے اختلاف کرتے ہوئے اُن کی تردید فرمائی، البتہ ترکوں کے محارباتِ طرابلس وبلقان میں گھر کے زیورات اور اصطبل کے گھوڑے تک چندے میں دے دیے۔ دہلی میں منعقد ہونے والے برطانوی شاہی دربار میں شمولیت سے انکار پر انگریز حکومت نے آپ کو اپنا مخالف سمجھ کر ایذا رسانی کی جانب میلان کیا، مگر آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ بعد ازاں حکومت نے سیکڑوں مربّع اراضی بطورِ جاگیر آپ کو دینا چاہی، مگر آپ نے قبول نہ فرمائی۔

اللہ کریم نے آپ کو محبوبیت کی خلعت عطا فرمائی تھی۔ جن لوگوں نے آپ کی زیارت کا شرف حاصل کیا ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ آپ جہاں کہیں بھی تشریف فرما ہوتے، وہاں آپ کے وجود سے بڑھ کر دل کش اور جاذبِ نظر کوئی چیز نہ ہوتی۔ سفر میں لوگ دست بوسی کے لیے ہجوم کرتے تو مخلصین کو آپ کے گرد حلقہ بنانا پڑتا۔ قبل از وقت اطّلاع ہونے کی صورت میں ریلوے اسٹیشنوں اور سڑکوں پر لوگ کئی کئی گھنٹے پہلے جمع ہو جاتے۔

آپ فرماتے تھے کہ جب مجھے تلقینِ سلوک پر مامور فرمایا گیا تو میں نے اللّٰہ کریم کی بارگاہ میں التجا کی کہ ربِّ کریم! تُو اپنے جن بندوں کی میری طرف رہنمائی فرمائے، اُن کے آرام اور جمعیت کی کفالت بھی خود ہی فرما، کیونکہ میرے پاس نہ تو فرصت ہے اور نہ مقدور؛ چنانچہ اللّٰہ کریم نے ہر بات کا انصرام اپنی قدرتِ کاملہ سے خود ہی فرما دیا۔ باکمال لوگ مختلف اطراف سے کھنچے چلے آئے اور عمر بھر کے لیے وابستۂ دامن ہوگئے۔ ابتدا میں ایک کمرا آپ کی رہائش کے لیے، ایک لنگر کا سامان رکھنے کے لیے اور دو کمرے درویشوں اور مہمانوں کے لیے تعمیر ہوئے۔ اساتذہ نے تلامذہ سمیت پتھّر، مٹّی اور گارا اُٹھا اُٹھا کر مسجد اور مکانات تعمیر کیے اور پتھریلی زمین میں ایک خاصا گہرا کنواں کھودا۔ یوں پتھّر، مٹّی اور گارے کا یہ فقیر خانہ ۱۳۱۳ھ/ ۱۸۹۵ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اگلے سال پختہ اور شاندار مسجد تیار ہوئی جس کی تعمیر میں حرم سرا کی پردہ نشینوں تک نے رات کی تاریکیوں میں حصّہ لیا۔ اِنھی ایّام میں بعض مشہور خطیب اور نامور ادیب رشتۂ اخلاص میں منسلک ہوئے۔ بعدازاں اہلِ سلوک میں سے کئی مشائخِ کرام کے صاحبزادگان سلسلۂ بیعت یا حلقۂ تلمّذ میں داخل ہوئے، اُن میں دیوان غیاث الدّین اجمیریؒ، دیوان سید محمد فریدیؒ اور خواجہ حسن نظامیؒ شامل ہیں۔

اُن دنوں آپ کی نشست پتھّر کی ایک مصلاّ نما سِل پر ہوا کرتی تھی جو پرانی عمارت کے سامنے درختوں کے سائے میں رکھی ہوئی تھی۔ فجر کی نماز اور اورادو وظائف سے فارغ ہوکر آپ مسجد سے نکلتے اور اِسی سِل پر آ کر تشریف رکھتے۔ اردگرد چٹائیوں کا فرش بچھ جاتا۔ علما، درویش اور مہمان حسبِ حاجت استفادہ کرتے۔ یہیں مجلسِ ذکر منعقد ہوتی، یہیں آپ مناظرے کرنے والوں کو

مسائلِ زیرِ بحث پر تقریریں لکھواتے، یہیں ۱۸۹۷ء میں آپ کی پہلی عظیم الشان کتاب ''تحقیق الحق'' قلمبند ہوئی اور قادیانیت پر ۱۹۰۰ء میں ''شمس الہدایت'' اور ۱۹۰۲ء میں ''سیفِ چشتیائی'' منصۂ شہود پر آئیں۔ اِسی جگہ مشائخِ طریقت اور اساتذۂ مدارس نے آپ سے مولانا رومیؒ کی ''مثنوی'' اور شیخ ابنِ عربیؒ کی ''فتوحاتِ مکّیہ'' و ''فصوص الحکم'' کا درس لیا۔ آپ کی راتیں پتھر کی اِسی سِل پر مراقبے میں گزر جاتیں۔ آپ جس پہلو پر بیٹھ جاتے، صبحِ صادق تک اُسی پہلو پر بیٹھے رہتے، ذرّہ برابر حرکت نہ کرتے۔ موسمِ سرما کی طویل اور برفانی راتیں صرف ایک کمبل میں کاٹ دیتے۔ صبح کے وقت کمبل پر برف جمی ہوتی، جسے اُٹھ کر جھاڑ دیتے۔ عشقِ الٰہی کی حدّت وحرارت اِس قدر تھی کہ رات کو وادی کے منجمد تالاب میں غسل فرماتے اور برف ہٹا ہٹا کر غوطے لگاتے:

قطرۂ خونِ دلِ جامؔی بہ دریا افگنند
سینہ بریاں، دل تپاں، ماہی زِ آب آید بروں

مسلسل دوزانو نشست اور کثرتِ مراقبہ کے باعث ایک موقعے پر رانیں بے سکت ہوگئیں اور چلنا پھرنا دشوار ہوگیا۔ طبیب نے مالش اور گھوڑے کی سواری تجویز کی، جس سے افاقہ ہوا۔

خاندانِ چشتیہ کی روایت میں ہے کہ حضرت خواجہ معین الدّین چشتیؒ نے برِّصغیر میں تبلیغِ اسلام کی خاطر حضور صلی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے باطنی طور پر سماع بالمزامیر کی اجازت حاصل کی تھی کیونکہ اہلِ ہند بہ لحاظِ طبع وتہذیب غنا کی طرف راغب تھے، چنانچہ اُن کے سامنے اسلام کی پیشکش اُنھی کے انداز میں کرنے سے بہت سرعت سے کامیابی ہوئی۔ آپ کا تعلّق چونکہ سلسلۂ چشتیہ سے

تھا، اِس لیے آپ غنا اور سماع کو جائز اور مباح سمجھتے تھے۔ آپ کو قوالی بہت پسند تھی اور آپ گاہے گاہے تخلیے میں شغلِ سماع کیا کرتے تھے۔

ایک موقعے پر اجمیر شریف کے ایک قوّال نے عربی کی یہ مشہور نعت:

اَلصُّبحُ بَدَا مِنْ طَلْعَتِہٖ

وَاللَّیلُ دَجٰی مِنْ وَّفْرَتِہٖ

پڑھی تو آپ وجد میں آ گئے۔ قوّال کو قیمتی کمبل اور قالین بخش دیے اور جب کمرے میں اُن سے بہتر کوئی چیز نہ رہی تو اصطبل کے گھوڑے بھی دے دیے۔

ایک دفعہ بارش کے لیے دعا کی استدعا پر قوّال کو ایک خاص انداز میں یہ غزل سنانے کا حکم دیا:

تُرکِ من اے مَہ غلامِ رُوئے تو

جُملہ تُرکانِ جہاں ہندوئے تو

آخری شعر تک پہنچتے پہنچتے بادل آنے شروع ہو گئے اور اللّٰہ کریم کے کرم سے بارش ہونے لگی۔

رات کا وقت تھا۔ ریل گاڑی ویران پہاڑوں میں سے گزر رہی تھی۔ قوّال آپ کی فرمائش پر پنجابی کے یہ اشعار گا رہا تھا:

دیکھو نی کی کر گیا ماہی

دلڑی لے کے ہو گیا راہی

ماہی دے سنیہڑے میکوں

کو کاں کوک سناواں کیکوں

ہسدیاں گل وچ پے گئی پھاہی
دیکھو نی کی کر گیا ماہی

گاڑی کا اینگلو انڈین گارڈ اجازت لے کر آپ کے ڈبّے میں بیٹھ گیا اور قوّالی سننے لگا۔ وہ پنجابی کلام کا مطلب تو نہ سمجھ سکا، مگر آپ کی کیفیت کے روحانی اثر سے بے خود ہو کر رونے لگا اور بولا، ''جی چاہتا ہے، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آپ کے قدموں میں زندگی گزار دوں۔''

گولڑہ شریف میں ایک شادی کے موقعے پر لڑکیاں یہ پنجابی گیت گا رہی تھیں:

اُچّی ڈھکّی گھر سامنے، میری ڈاڈھے نال پریت
ناں توڑی، ناں توڑساں، ناں توڑن دی ریت

گرمیوں کا موسم تھا۔ آپ گھر کی چھت پر شغل و ذکر میں محو تھے۔ گیت سن کر وجد میں آ گئے۔ شادی والے گھر میں آپ کے وجد کی خبر پہنچی تو لڑکیاں رات گئے تک وہی گیت گاتی رہیں۔ جب آپ نے منع کروایا تب اُنھوں نے گانا بند کیا۔

آپ کے ذوقِ عالی کا انداز فقط رسمی سماع، حُسنِ صوت اور رنگِ سخن ہی کا پابند نہ تھا، بلکہ اکثر روزمرّہ کی باتوں میں سے محض کوئی نکتہ یا لفظ ہی عشقِ سرمدی کا ساز چھیڑنے کے لیے مضراب کا کام کر جاتا اور آپ پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی۔

ایک روز عصر کی نماز کے بعد مسجد سے مہمان رخصت ہو رہے تھے کہ کسی نے موت کا ذکر کیا۔ آپ پر کیفیت طاری ہو گئی، ایک آہ بھری اور حسرت بھرے لہجے میں فرمایا، ''ابھی یہ نعمت کہاں۔''

آپ کے معمولات اور مشاغل ایسے لگے بندھے تھے کہ اُن میں بہت کم

تغیّر ہوتا تھا۔ نمازِ فجر کی سنّتیں پڑھ کر حجرے سے مسجد میں آتے اور امام کا انتظار کرتے۔ اگر وہ کسی وجہ سے نہ آسکتے تو کسی دوسرے قابلِ امامت شخص کو امام بنا لیتے۔ دس بجے تک اورادو وظائف میں مشغول رہتے۔ اِس دوران کسی سے بات نہیں کرتے تھے۔ ساڑھے دس گیارہ بجے دیوان خانے میں تشریف لاتے۔ اُس وقت ہر شخص کو بات کرنے کی اجازت ہوتی تھی۔ ارشادو تلقین کا سلسلہ بھی جاری رہتا اور مخلصین سے گفتگو بھی ہوتی رہتی۔ بارہ ساڑھے بارہ بجے حجرے میں چلے جاتے، کھانا کھا کر قیلولہ کرتے اور ایک گھنٹے بعد ظہر کی نماز کے لیے مسجد میں چلے جاتے۔ اکثر ظہر کے وضو سے عصر کی نماز پڑھتے، پھر ختمِ خواجگان پڑھواتے اور گھوڑے پر سوار ہو کر تین چار کلومیٹر سیر کرتے۔ مغرب اور عشا کی نمازیں باہر ہی ادا کرتے۔ رات گئے واپس آ کر کھانا تناول کر کے سو جاتے، تہائی رات باقی ہوتی کہ بیدار ہو کر تہجّد کی تیاری میں لگ جاتے۔

آپ کا قد میانہ، رنگ گندمی، پیشانی بلند و چمکدار، آنکھیں مخمور و رعب آفریں، ابرو گھنے و کماندار، ناک ستواں، لب متوسّط، دہن فراخ، دندان روشن و جدا جدا، داڑھی لمبی و گھنی، بال گھنگھریالے و لمبے، سینہ کشادہ، بطن خمیدہ، انگلیاں ملائم و باریک، قدم نرم و نازک اور جسم گٹھا ہوا تھا۔ آپ کو سفید لباس پسند تھا۔ لٹھے کی شلوار، ململ کا آستینوں والا کُرتا اور سفید ململ کی ہلکی مایہ لگی ہوئی پگڑی پہنتے۔ دستار پُرنوکدار کلاہ ہوتی۔ کُرتے کے اوپر واسکٹ اور لمبا کھلے کالر کا کوٹ ہوتا۔ پاؤں میں گھیبی نمونے کی نفیس و نصف طلادار پاپوش استعمال کرتے۔ ہاتھ میں ہمیشہ تسبیح رہتی۔ آپ کی آواز شیریں، پُرسوز اور باوقار تھی۔ یوں متانت سے گفتگو کرتے کہ ایک ایک لفظ گنا جا سکے۔ آپ کی رفتار اور چال ڈھال میں اہلِ علم کو وقار و

سلامت روی نظر آتی اور اہلِ دل کو بانکپن و محبوبیت۔

اکہتر بہتر سال کی عمر تک آپ کی صحت اچھی رہی، مگر پھر ضعف کے آثار پیدا ہونے لگے۔ قلّتِ طعام، قلّتِ کلام اور قلّتِ منام ابتدا ہی سے آپ کے معمولات رہے۔ دائمی ذکر اور پاسِ انفاس کے شغل نے آپ کو خواب وخور سے بے نیاز کر دیا تھا۔ غالبًا اِسی وجہ سے معدے نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا اور ہچکی شروع ہوگئی تھی۔ جیسے جیسے آپ کی عمر بڑھ رہی تھی، آپ کا مشاہدہ تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ ۱۹۲۵ء تک یہ حالت ہوگئی تھی کہ خلوت ہو یا جلوت، ایک وجدانی کیفیت طاری رہتی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک آہ بھر کر سر اُٹھاتے اور باطنی کیفیات کے باعث چہرے کا رنگ کبھی زرد، کبھی سبز اور کبھی سرخی مائل ہو جاتا۔ اپنے معمولات کے مطابق مجلس خانے میں بہ دستور گھنٹے دو گھنٹے کے لیے تشریف لاتے، مگر محفل پر خاموشی طاری رہتی۔ حاضرین میں سے بعض پر گریہ طاری ہو جاتا اور بعض حسرت بھری نظروں سے دیکھتے رہتے۔ ۱۹۳۶ء تک اِس کیفیت کا ورود انتہا کو پہنچ گیا۔ پہلے نماز کے لیے مسجد جانے سے معذور ہوئے، پھر بستر پر نماز پڑھنے لگے۔ اُس کے بعد اشاروں سے نماز ادا ہونے لگی۔ آخر کار اشاروں سے بھی معذوری ہوگئی اور مسلسل استغراق کی کیفیت طاری رہنے لگی۔ اُن ایّام میں اربابِ سلوک اور اصحابِ منزل دُور دُور سے کھنچے چلے آتے تھے۔ اُن میں اہلِ جذب وسُکر کی کثرت ہوتی تھی۔ وہ آپ کے حجرے میں داخل ہو کر پائنتی کو بوسہ دیتے، کچھ دیر چپ چاپ آپ کو دیکھتے رہتے اور پھر خود ہی دعا مانگ کر رخصت ہو جاتے؛ نہ سوال ہوتا، نہ جواب۔

مارچ، اپریل 1937ء میں آپ نے متعدّد مرتبہ سورۂ یاسین، سورۂ

یوسف، سورۂ تغابن، سورۂ ملک، سورۂ مزمّل، درودِ مستغاث، درودِ کبریتِ احمر، دعاے کبیر اور سلسلۂ مشائخِ کرام استماع فرما کر حاضرین، غیرِ حاضرین، متوسّلین، غیرِ متوسّلین اور تمام امّتِ مرحومہ کے لیے اللّٰہ کریم سے دعا مانگی۔ محرم، صفر ۱۳۵۶ھ میں زائرین کی تعداد بڑھتی چلی گئی، حتّاکہ چھ سات سَو یومیہ تک پہنچ گئی۔ اُنھی دنوں آپ کو زکام اور میعادی بخار کا عارضہ لاحق ہوا۔ آخری تین روز یہ کیفیت رہی کہ بار بار دونوں ہاتھ دعا کے لیے اُٹھاتے اور اپنے چہرے کے سامنے تک لے جاتے، اِس کے علاوہ مکمّل سکوت۔

۲۹ر صفر ۱۳۵۶ھ/ ۱۱رمئی ۱۹۳۷ء منگل کے روز یہ حالت تھی کہ دائیں ہاتھ کی نبض رک رک کر چل رہی تھی اور بائیں ہاتھ، یعنی قلب کی جانب کی نبض حسبِ معمول جاری تھی۔ ساڑھے پانچ بجے دونوں ہاتھ اُٹھا کر اشارہ کیا، جس کی تعمیل میں سہارا دے کر اُٹھایا گیا اور آپ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ اُس وقت آپ نے گردن کو ایک طرف ذرا سا جھکا کر تبسّم فرمایا۔ اُس دل نواز اور ایمان افروز تبسّم میں مسرّت، حیا اور نیاز کا ایسا حسین امتزاج تھا کہ حاضرین کی زبانوں پر بے ساختہ 'سبحان اللّٰہ' کا ورد جاری ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد آپ کے اشارے پر آپ کو دوبارہ لٹا دیا گیا۔ چند لمحے بعد آپ نے اسم ذات 'اللّٰہ' آہستہ، مگر طویل اور عمیق آواز میں زبانِ شوق اور قلبِ عرفان سے ادا فرمایا۔ یہ کیفیت عالمِ نمود کی الوداعی جھلک تھی، چہرہ کیفِ وصال سے مجسّمۂ نیاز نظر آیا؛ پھر دوبارہ اور سہ بارہ اِسی طرح اسمِ ذات کا اعادہ فرما کر قبلہ رُو ہو گئے:

صورت از بے صورتی آمد برون
باز شد اِنّا اِلَیہِ راجعون

دوسرے روز یکم ربیع الاوّل/۱۲؍مئی بدھ کے روز ساڑھے چھ بجے شام آپ کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔ ایک اندازے کے مطابق ڈیڑھ دو لاکھ افراد شریک ہوئے۔ اُن میں ہندو، سکھ اور عیسائی بھی سیکڑوں کی تعداد میں سب سے پیچھے کی صفوں میں ہاتھ باندھ کر کھڑے رہے۔ آٹھ بجے رات آپ کو مسجد کے جنوبی باغ میں دفن کر دیا گیا۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

آپ کے وصال کے بعد آپ کے علمی اور روحانی فیض کا سلسلہ آپ کے بیٹے اور جانشین حضرت پیر سیّد غلام محی الدّین شاہ گیلانیؒ کے ذریعے جاری رہا اور اُن کے وصال کے بعد اب یہ سلسلہ اُن کے بیٹوں اور جانشینوں اور آپ کے پوتوں اور مریدوں حضرت پیر سیّد شاہ غلام معین الدّین گیلانی اور حضرت پیر سیّد شاہ عبدالحق گیلانی کے ذریعے جاری ہے۔

محمد خالد جذبی